خفیہ کارروائیاں ــــ وقت کا تقاضا

تھامس ایچ ہنرکسن*

تلخیص: ڈاکٹر فخرالاسلام

لارڈ ایکٹن کی شہرہ آفاق کہاوت کہ ''مطلق طاقت انسان کو بدعنوان بناتی ہے'' تھوڑی سی تحریف جائز کرتے ہوئے اگر یوں کہا جائے کہ ''مطلق فوجی طاقت انسان کو بداطوار بناتی ہے'' تو بے جا نہ ہوگا۔ اسی طرح ٹیکنالوجی کی بے پناہ طاقت بھی قومی مقاصد حاصل کرنے کے بہانے پالیسی سازوں کو گھٹیا حربے آزمانے پر اکساتی ہے۔ بلاشبہ سلامتی کے بعض مسائل طاقت کا گرز استعمال کرنے سے ہی حل کیے جاسکتے ہیں تاہم خارجہ پالیسی سے متعلق بہت سارے مسائل ایسے ہیں جن کا حل تصادم سے اجتناب میں مضمر ہوتا ہے۔ مانا کہ واحد سپر طاقت کی حیثیت سے امریکہ کو طاقت کی سفارت کاری سے کام لینا چاہیے خاص کر جب اس کے تزویراتی (strategic) مفادات کو خطرہ لاحق ہو لیکن ایسا بھی نہیں جیسے کہ اس نے حالیہ دنوں میں مختلف قضیوں میں ہوائی حملوں پر ضرورت سے زیادہ انحصار کر کے نہ صرف اپنی ساکھ کو نقصان پہنچایا بلکہ عالمی طاقتوں سے اس کے تعلقات بھی خاصے متاثر ہوئے ہیں۔ تصادم سے گریز کا رویہ نہ صرف یہ کہ امریکہ کے مقاصد کے حصول کو بغیر جانی و مالی نقصان کے ممکن بناتا ہے بلکہ اتحادیوں کے ساتھ ساتھ روس و چین سے اس کے تعلقات کو بہتر بنا سکتا ہے۔ چونکہ یہی پالیسی سرد جنگ کے زمانے میں امریکہ کا طرہ امتیاز تھا اس لیے آج کے دور میں بھی براہ راست فوجی کارروائی کا بہترین نعم البدل ہوسکتی ہے۔

یوگوسلاویہ اور عراق پر فضائی حملوں کے طویل سلسلے کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ امریکہ اپنا ایجنڈا کس طرح آگے بڑھاتا ہے۔ متعدد مبصرین نے کوسوا کے بحران کے بعد یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ ایک بالکل

* Thomas H. Henriksen, "Covert Operations, Now More Then Ever", *Orbis*, Winter 2000, pp. 145-156.

اجنبی خطہ جہاں سے امریکی مفاد کم وابستہ ہوں وہاں اسے فوجی مداخلت سے اجتناب کرنا چاہیے خواہ وہاں انسانیت کو شدید خطرات ہی کیوں نہ لاحق ہوں۔ دوسرا گروہ ان مبصرین کا بھی ہے جن کے خیال میں امریکہ کو نہایت سرعت کے ساتھ نہ صرف فضائی حملے کرنے چاہییں تھے بلکہ اپنی بری افواج کو بھی کوسووا میں اتار دینا چاہیے تھا۔ ایسا کرنا امریکی ساکھ اور اخلاقی قدروں کے لیے ضروری تھا۔ بہرحال کوسووا پر مسلسل بمباری سے شہری آبادی جس قدر متاثر ہوئی اس سے نہ صرف امریکہ کی اخلاقی ساکھ کو دھچکا لگا بلکہ یہ حملے بلغراد کے مظالم روکنے میں ناکام رہے۔ بااین ہمہ اس غیر اہم قضیے کی وجہ سے ایک طرف روس و چین سے تعلقات کشیدہ ہوئے اور دوسری طرف نیٹو (NATO) میں بھی دراڑیں پڑ گئیں۔ معاً یہ بھی ہوا کہ ان حملوں کے طفیل سلوبودان ملازووچ کے اقتدار کو دوام ملا۔ سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ کو سووا میں خاموشی اور جنگ کے درمیان تیسرا راستہ اختیار نہیں کر سکتا تھا؟

بلا واسطہ مداخلت میں کامیابی کی نسبت ناکامی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ دوسری جانب بالواسطہ کارروائیوں میں ٹکنالوجی اور قوت کے استعمال سے زیادہ جن چیزوں کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے ان میں مقامی سیاست پر اثر اندازی، مقامی ثقافت کا ادراک اور غیر ملکی زبانوں کی تفہیم شامل ہیں۔ پھر یہ کہ آپ دنیا کے ردعمل کا بھی خیال رکھیں گے۔ مختصراً اس نوعیت کی کارروائیوں میں مقامی حزب مخالف کو قوت فراہم کر کے مخالف حکومتوں کو گرایا جا سکتا ہے۔

یوگوسلاویہ پر نیٹو کی مسلسل بمباری کے باوجود ملازووچ نے نہ صرف یہ کہ ''نسلی صفائی'' کی مہم جاری رکھی بلکہ بلقان کے فوجی معاہدہ کے طفیل اقتدار سے چمٹے رہے۔ اسی طرح لیبیا کے معمر قذافی اور عراق کے صدر صدام حسین بھی امریکہ کے سامنے گھٹنے ٹیکے بغیر برسر اقتدار رہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تباہ کن ہتھیار بنانے والے ''بدمعاشوں'' سے کوئی اور معاملہ کیا جائے۔ امریکہ کو چاہیے کہ جہاں کہیں اس کے مفادات، علاقائی امن، جمہوری امن اور انسانی حقوق کو خطرات لاحق ہوں وہاں روایتی سفارتی اقدامات سے کام لے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ بعض مضبوط مخالفین کو روایتی اقدامات یعنی پابندیوں، دھمکیوں اور رشوت سے زیر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایران، عراق، شمالی کوریا، سربیا اور کیوبا کے حکمران ایسے سخت اخروٹ ہیں جنہیں محض پابندی لگانے یا ان کے ملکوں سے سفارتی عملہ واپس

بلانے سے نہیں توڑا جا سکتا۔ جہاں تک اقتصادی پابندیوں کا تعلق ہے، دیکھا یہ گیا ہے کہ ان سے فائدے کی بجائے پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں کہ ان کی زد میں اکثر و بیشتر بے گناہ لوگ آتے ہیں۔ بین الاقوامی قوانین اور جنگی جرائم کی عدالتوں کے طریق کار میں بھی اس قدر جھول ہیں کہ جنگی مجرموں کو با آسانی کیفر کردار تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد اپنے مخالفین سے نمٹنے کے لیے امریکہ نے دو قسم کے اقدامات پر انحصار کیا۔ پہلا یہ کہ ہدف ممالک میں اصلاح پسندوں کی حمایت اور دوسرا بھرپور خفیہ کاروائیاں۔ ان اقدامات پر عمل کے دوران مالی اور فنی تعاون سے ذرائع ابلاغ کی ترقی، نچلی سطح پر برپا سیاسی تحریکوں کا استحکام، ریڈیو نشریات کی ترسیل اور پیشہ ورانہ ماہرین، طلبہ، دانشوروں اور صحافیوں کے تبادلے جیسے امور شامل رہے ہیں۔ ان اقدامات کی پشت پر منطق یہ تھی کہ آہنی پردوں میں بند روسی بلاک کے معاشروں کو آزاد کرایا جائے۔ دیوار برلن کے انہدام کے بعد امریکی مدد سے بلغاریہ، لتھوانیا، رومانیہ اور سلواکیہ میں انتخابات کے بعد اشتراکی قیادتوں کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے۔ درج بالا ممالک کو امریکہ نے جس انداز سے مدد فراہم کی، ناقدین نے اسے خفیہ کاروائیوں کی بجائے کھلم کھلا مداخلت سے تعبیر کیا، یوں اصلاح پسندی اور تخریب کاری کا فرق دھندلا گیا۔ ۱۹۸۳ء میں امریکہ نے ''قومی ٹرسٹ برائے جمہوریت'' کے نام سے قائم کردہ وقف کے ذریعے بیسیوں ممالک میں جمہوریت کو فروغ دیا، اس ادارے نے گویا وہ کام اپنے ذمے لیا جو گزشتہ دہائیوں میں سی-آئی-اے کرتی رہی ہے۔ تاہم یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس قسم کے اصلاح پسند اقدامات شمالی کوریا، عراق اور شام میں سیاسی عناصر کی تباہی کا باعث ہو سکتے ہیں۔

کسی بھی ناپسندیدہ حکومت کے خاتمے کے لیے ظاہری سے لے کر خفیہ کارروائی تک پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ صدر آئیزن ہاور خفیہ کارروائیوں کے پرجوش حامی تھے لیکن انہوں نے مصر کے جمال عبدالناصر کا تختہ الٹنے کا خیال اس لیے ترک کیا تھا کہ انہیں محسوس ہوا تھا کہ مصر کے حالات ایران سے کافی مختلف تھے، جہاں سی آئی اے نے محمد مصدق کو اقتدار سے محروم کر دیا تھا۔ اس کے برعکس صدر بش کو جب اندازہ ہوا کہ پانامہ کے مرد آہن مانویل نوریگا کا تختہ الٹنا عام حالات میں ممکن نہیں رہا تو اس نے فوجی مداخلت کو ترجیح دی۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ ناگوار حکومت کا اگر معقول متبادل میسر ہو تو سمجھ

بوجھ اور پیشہ ورانہ منصوبہ عمل کی حامل خفیہ کارروائی کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ ایسی کارروائیوں میں جان ومال اور سیاسی ساکھ کا کم ہی نقصان ہوتا ہے۔

امریکی تاریخ میں خفیہ کارروائیوں کے حوالے سے کچھ ناکامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں صدر آئیزن ہاور کو انڈونیشیا میں اس وقت منہ کی کھانی پڑی جب اس نے وہاں کی اشتراکی حکومت کے خلاف ایک احمقانہ بغاوت کی حمایت کی۔ اسی طرح کاسترو کے کیوبا میں بھی امریکہ شکست سے دوچار ہوا، جب اس کے تربیت یافتہ ۱۴۰۰ کیوبن جلاوطن باشندوں کا حملہ ناکام ہوا۔ ان دو ناکامیوں کی پشت پر ناقص منصوبہ بندی اور کمزور عمل درآمد جیسی وجوہات کارفرما تھیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی تاسیس سے ہی خفیہ کاروائیوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ مثال کے طور پر جارج واشنگٹن نے کانگریس سے منظور کردہ فنڈ کو نہ صرف سراغرسانی میں خرچ کیا بلکہ اس میں سے ایک حصہ الجزائر میں امریکی یرغمالیوں کی بازیابی کے لیے بطور رشوت بھی ادا کیا۔ اس طرح صدر جیفرسن نے حکومت یونان کے خلاف مختلف قبائل کو منظم کرنے کے لیے تربیت یافتہ امریکی ایجنٹ وہاں بھجوائے۔ اس ضمن میں خاکنائے پانامہ (Isthmus of Panama) پر صدر روز ویلٹ کی طرف سے کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ انہوں نے بحراوقیانوس اور بحرالکاہل کو ملانے کے لیے نہر تعمیر کرنے کی کوشش کی تھی تاہم امریکہ اور کولمبیا حکومت کے درمیان اسی حوالے سے جو معاہدہ ہوا تھا اسے کولمبیا کی پارلیمنٹ نے منسوخ کر دیا۔ عین اسی وقت صدر روز ویلٹ طبل جنگ بجا سکتے تھے لیکن ایسا کرنے کے بجائے اس نے پانامہ میں برپا بغاوت کی حوصلہ افزائی کی جس کے ذریعے کولمبیا کی مزاحمت پر قابو پا لیا گیا۔ وہاں جو شورش برپا ہوئی اس کے صرف تین دن بعد امریکہ نے جمہوریہ پانامہ کو تسلیم کر لیا۔ اس دوران بغاوت کو کچلنے کے لیے بگوٹا نے فوج اتارنے کی جو کوشش کی تھی امریکی آبدوزوں نے اسے ناکام بنا دیا، اس کے علاوہ کولمبیا کے امیر البحر کو رشوت دے کر خاموش کر دیا، اس کے نتیجے میں امریکہ اور پانامہ کے درمیان نہر کا علاقہ پٹے پر دینے کا معاہدہ ہوا۔ بالکل اسی انداز سے دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ کے دفتر برائے حربی امور نے محوری طاقتوں کے خلاف متعدد کاروائیاں کیں جن میں سراغرسانی سے لے کر اگلے مورچوں کے قریب گوریلوں کو اسلحہ بہم پہنچانے جیسے اقدامات شامل تھے۔

خفیہ کارروائیاں اور سرد جنگ ـــ برسرزمین حقیقت

جنگ عظیم دوئم کے بعد دونوں عالمی طاقتوں (روس و امریکہ) کے درمیان انوکھی نظریاتی، عسکری اور سفارتی رقابت شروع ہوئی۔ سوائے کوریا اور ویت نام کے، واشنگٹن اور ماسکو کے درمیان زیادہ تر کشمکش بالواسطہ رہی۔ مدعا یہ تھا کہ دونوں کے درمیان ایٹمی جنگ کی نوبت نہ آنے دی جائے۔ اس دور میں امریکہ نے مختلف ممالک میں اپنے دوستوں کی مدد سے ان حکمرانوں کا تختہ الٹنا شروع کر دیا جو روسی مقاصد کو پروان چڑھا رہے تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں واشنگٹن نے اٹلی اور فرانس کی کرسچین ڈیموکریٹ جماعتوں کو اس مقصد کے لیے مالی مدد فراہم کی کہ وہاں اشتراکیوں کو اقتدار میں آنے سے روکا جائے۔ اس طرح پورے یورپ میں مارشل پلان کے سائے میں سی آئی اے سرگرم عمل رہی۔ یورپ کے علاوہ امریکہ نے فلپائن میں رامن مکسیسے کو اشتراکی نواز ھک باغیوں کے خلاف مدد فراہم کی۔ اس کے علاوہ یونان کی خانہ جنگی میں کمیونسٹ شورش پسندوں کو پسپا کر دیا۔ ۱۹۵۳ء میں اس نے ایران میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے مصدق کا تختہ الٹنے میں خفیہ مدد فراہم کی اور یوں شاہ کا دوبارہ اقتدار میں آنا ممکن ہوا۔ ایران کی اس مہم پر ایک بلین ڈالر سے کم خرچ ہوئے۔ ایک سال بعد واشنگٹن نے گوئٹے مالا میں اشتراکی نواز آربنیز (Arbens) حکومت کے خلاف کامیاب خفیہ کاروائی کی۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۷۳ء میں چلی کی ''سلواڈور آلینڈے'' کی زیر قیادت سوشلسٹ حکومت گرانے پر امریکہ کے ۸ ملین ڈالر خرچ ہوئے۔

اس سے انکار نہیں کہ خود امریکہ اور اس سے باہر کی دنیا میں مذکورہ بالا کارروائیوں پر تنقید بھی خوب ہوئی اور انہیں امریکی استعماریت سے تعبیر کیا گیا، لیکن ان کے موثر اور بروقت ہونے میں کسی کو شک نہیں رہا۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ شاہ کا ایران نہ صرف ایک جدید و ترقی یافتہ ملک بنا بلکہ مشرق وسطیٰ کی سیاست میں اہم کردار بھی ادا کرتا رہا۔ اس طرح آلینڈے کے بعد کا چلی، لاطینی امریکہ میں اقتصادی ترقی، سیاسی استحکام اور جمہوری اقدار کا مینارہ نور ثابت ہوا۔

سرد جنگ کے عروج کے زمانے میں امریکہ نے لاطینی امریکہ میں کاسترو کی طرف سے مارکسیت بزور شمشیر پھیلانے کی کوششوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مثلاً اس نے گوئٹے مالا میں سرکاری فوجوں کو تربیت دی

جنہوں نے اشتراکی چھاپہ ماروں پر قابو پالیا۔ چنانچہ آج بھی یہ ملک امریکی مفادات کا نگہبان بنا ہوا ہے۔ وسطی امریکہ کے دوسرے ممالک میں بھی امریکہ کو کیوبا کی پشت پناہی میں ہونے والی تخریب کاری کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا مقابلہ خشکی یا فضائی حملوں سے ممکن نہ تھا بلکہ امریکہ نے ایل سلواڈور کی حکومت اور نکاراگوا کے ''کونٹرا'' باغیوں کو امداد بہم پہنچا کر ماسکو کے اثر و رسوخ کو روکے رکھا۔ اگر اس پالیسی کا جائزہ ان حقائق کی روشنی میں لیا جائے کہ اس سے امن کے قیام، معاشی ترقی اور استحکام، میں کتنی مدد ملی تو ایل سلواڈور میں ریگن انتظامیہ کے کردار کو داد دینا پڑتی ہے۔ اسی طرح نکاراگوا میں کونٹرا باغیوں نے پہلے تو ساندنستا حکومت کو چیلنج کیا اور پھر ۱۹۹۰ء کے صدارتی انتخابات میں اسے شکست فاش دی۔

۱۹۸۰ء کے اوائل میں ریگن انتظامیہ نے پولینڈ کی مزدور تحریک ''سالیڈیریٹی'' کو تمام تر مشکلات کے باوجود سہارا دیا۔ اس نے حکومت کی زیر عتاب مزدور تحریک کو خفیہ طور پر نقد رقم، مواصلاتی سامان کی ترتیب اور اطلاعات کے تبادلے جیسی سہولتیں فراہم کیں جس کے نتیجے میں سالیڈیریٹی کامیاب ہوئی اور یوں سوویت یونین کو بڑا دھچکا لگا۔ اسی طرح ۱۹۷۹ء میں ریگن انتظامیہ نے افغان مجاہدین کی تربیت میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ جنگ کے اواخر میں جب امریکہ نے مجاہدین کو سٹنگر میزائل فراہم کیے تو روس کے لیے فضا سے زمین پر حالات قابو کرنا ممکن نہیں رہا۔ یوں مغرور سرخ فوج کوہستانی قبائل کے سامنے بے بس نظر آنے لگی۔ یہ افغانستان میں روس کی شکست تھی جس نے کمیونسٹ پارٹی میں دراڑیں ڈال دیں، جو وسط ایشیا میں روسی استعمار کے خاتمے پر منتج ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ کو سب سے بڑی کامیابی افغانستان میں حاصل ہوئی لیکن افغان مجاہدین کو ریگن انتظامیہ کی مدد نے ایک اور بحث کا آغاز کر دیا ہے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ اس امداد کا شاخسانہ ہے کہ آج افغانستان کا زیادہ تر علاقہ بنیاد پرست طالبان کے قبضے میں ہے جو سعودی نژاد ''تخریب کار'' اسامہ بن لادن کو پناہ دیے ہوئے ہیں۔ مگر اس قسم کی تنقید تاریخی حقائق سے آنکھیں بند کرنے کے مترادف ہے۔ افغانستان معاشرتی طور پر ایک منقسم ملک ہے۔ سوویت یونین نے وہاں غلبہ حاصل کرنے کے لیے ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر مقامی کٹھ پتلیوں کو استعمال کیا جس سے معاشرتی تقسیم اور بھی گہری ہوگئی۔ اس کے مقابلے میں ریگن نے پہاڑی قبائل کو روس کے مقابلے میں متحد کر دیا نتیجتاً انہوں نے متحد ہو کر روس کا اس طرح مقابلہ کیا جس

طرح پچھلی صدی میں انہوں نے انگریزوں کا کیا۔

مشرق وسطٰی اور خلیج میں براہ راست امریکی مداخلت جس میں اسرائیل کو ہنگامی فضائی مدد، خود جنگ خلیج، خاص طور پر سعودی عرب میں اس کی افواج کی موجودگی شامل ہیں، سے خطے میں امریکہ مخالف جذبات کو تقویت ملی ہے۔ جب امریکہ کی افغانستان، انگولا، موزمبیق، ایتھوپیا، کمبوڈیا، پیرو اور ویت نام میں خفیہ کارروائیوں کا موازنہ سوویت یونین کی براہ راست مداخلت سے کیا جاتا ہے تو ایک بار پھر امریکہ کو داد دینا پڑتی ہے کیونکہ جہاں اس نے خفیہ کاروائیاں کیں (جیسے چلی، گوئٹے مالا، ایل سلواڈور اور نکاراگوا میں) وہ ممالک روس نواز شمالی کوریا، ویت نام، یمن، صومالیہ اور کیوبا سے زیادہ بہتر ترقی کے امکانات رکھتے ہیں۔

مواقع کا ضیاع

سرد جنگ کے بعد امریکی انتظامیہ نے طاقت کے روایتی اظہار کی پالیسی اپنائی ہے۔ ان کے خیال میں طیارہ بردار بحری جہاز، زمینی افواج اور بمبار طیارے اتنے طاقتور ہیں جن کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ زمانہ امن میں امریکہ اتنا جھگڑالو کبھی نہیں رہا جتنا آج ہے۔ خفیہ کاروائیوں کا پہلو آج خوابیدہ پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ بش اور کلنٹن میں سے کسی نے بھی صدام مخالف ان مزاحمتی تحریکوں کی کماحقہٗ مدد نہیں کی جن کو امریکہ امداد فراہم کرتا چلا آیا ہے۔ چنانچہ جنگ خلیج کے اختتام پر بش کی شہ پر جب شیعوں نے بغداد کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو واشنگٹن نے انہیں عراقی افواج کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ تاہم دوسری طرف بش نے شمالی عراق میں ہلکے ہتھیاروں سے لیس امریکی فوج، تھوڑی رقم اور سی آئی اے کی مدد سے ایک نوزائیدہ کرد ریاست کے قیام کی راہ ہموار کی۔ کلنٹن نے اقتدار سنبھالتے ہی اول تو امداد میں کمی کر دی اور پھر عراقی نیشنل کانگریس کو کلی طور پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ نتیجتاً عراقی مطلق العنان کسی طاقت ور حزب مخالف سے محفوظ رہا۔

جب کلنٹن انتظامیہ، صدام کے سامنے بے بس نظر آنے لگی تو امریکی کانگریس نے ۱۹۹۸ء میں عراقی لبریشن ایکٹ نامی قانون کی منظوری دی جس کی رو سے عراقی آمر کو ہٹانے کے لیے ۹۷ ملین ڈالر کی

رقم مخصوص کی گئی۔ اس رقم سے عراقی حزب مخالف کو ہتھیاروں کی فراہمی اور آزاد عراقی ریڈیو کا قیام عمل میں لانا تھا۔ ساتھ ہی امریکہ عراق میں فوجی بغاوت کی توقع کرتا رہا تاہم خود امریکی انتظامیہ میں اختلاف، عراقی حزب مخالف میں انتشار اور پڑوسی ممالک کے خدشات نے اس منصوبے کو خاصا پیچیدہ بنا دیا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس نے صدام کو خاصا پریشان کر دیا ہے۔

اگرچہ متحرک خفیہ کارروائیوں کے راستے میں کافی رکاوٹیں ہوتی ہیں لیکن ان کے ذریعے ایک بہتر تبدیلی کے امکانات ضرور موجود ہوتے ہیں بہرکیف مسلسل فضائی حملے جو ۱۹۹۸ء کے بڑے حملوں پر منتج ہوئے کم از کم صدام حسین کو اقتدار سے محروم کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

بلقان کے قضیے میں امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے مسلح تربیت دینے والی ایک فرم Military Professional Resources Incorporated (MPRI) سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت مذکورہ ادارے نے سرب ملیشیا کے مقابلے میں کروٹ فوجیوں کو تربیت دینے کی حامی بھر لی۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ سرب ملیشیا بوسنیا ہرزیگووینا میں ''نسلی صفائی'' کی مہم میں غیر سربوں کا قتل عام کر رہی تھی۔ MPRI کا صدر دفتر ورجینیا میں تھا اس کا قیام ۱۹۸۷ء میں عمل میں آیا اور اس کے عملے میں زیادہ تر ریٹائرڈ امریکی فوجی افسر شامل تھے۔ ۱۹۹۴ء میں اس ادارے نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس تربیتی پروگرام کے ساتھ ساتھ زغرب حکام نے ایک بلین ڈالر کے عوض روس، یوکرائن، اسرائیل اور سنگاپور سے ٹینک، توپ اور ہوائی جہاز خریدے۔ کروٹوں نے اس اسلحے سے بھی اپنا حصہ وصول کیا جو ایران کی طرف سے بوسنیا کے مسلمانوں کو فراہم کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ اسلحے کی ترسیل اور امریکی تربیت سے ایک جدید کروٹ فوج وجود میں آئی۔ اس منصوبے پر عمل کرنے کے دوران امریکہ میں کوئی مخالفانہ آواز بلند نہ ہوئی، کیونکہ وہاں سب کا خیال تھا کہ بوسنیا میں قتل عام رکوانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ تاہم ریپبلکن پارٹی نے ایرانی اسلحہ کی ترسیل کی اجازت دینے پر کلنٹن انتظامیہ کو اس لیے تنقید کا نشانا بنایا کہ اس سے یورپ کے وسط میں بنیاد پرست اسلام کو قدم جمانے کا موقع ملنے کا امکان تھا۔ بعد میں MPRI نے مسلم کروٹ وفاق کی فوج کو تربیت دی اور ۱۰۰ ملین ڈالر کا اسلحہ فراہم کیا۔ یہ رقم بعض خلیجی ریاستوں نے ادا کی۔ مختصراً مذکورہ امریکی ادارے نے واشنگٹن کو اخراجات اور خطرات سے بڑی حد تک بچا لیا، چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلقان میں

زمینی افواج نہ بھیجنے اور مقامی افراد کو مسلح کرنے کا امریکی فیصلہ نہایت معقول تھا۔ ان ہی امریکی تربیت یافتہ کروٹ افواج نے بعد میں علاقے کے توازن کو ڈرامائی انداز میں بدل دیا، انہوں نے سرب افواج کو کراجنیا کی طرف دھکیل کر ان کے ناقابل تسخیر ہونے کے زعم کو خاک میں ملا دیا۔ ملازووچ کو نیٹو کی بمباری نے نہیں بلکہ کروٹوں کی فوجی کاروائیوں نے ڈیٹن معاہدے پر مجبور کر دیا اور سچ تو یہ ہے کہ اگر کروٹوں کو مزید کارروائیوں کی اجازت دی جاتی تو سربیا میں بڑھتی ہوئی بے چینی ملازووچ کو اقتدار سے محروم کرتی لیکن کلنٹن انتظامیہ نے سرب رہنما سے معاہدہ کر کے اس موقع کو ضائع کر دیا۔ ۱۹۹۶ء کے آخری دنوں اور ۱۹۹۷ء کے اوائل میں ایک اور موقع ہاتھ آیا جب بلغراد میں احتجاجی مظاہرے بھڑک اٹھے۔ حکومت مخالف جمہوریت پسندوں کی حمایت ہر طبقے میں نظر آ رہی تھی۔ ملازووچ صرف وزارت داخلہ کے مسلح دستوں کے رحم و کرم پر تھا اس سنہری موقع پر جمہوریت پسندوں کے ساتھ امریکی تعاون کا نتیجہ ۱۹۸۹ء میں رومانیہ کی طرح برآمد ہو سکتا تھا جہاں عوامی طاقت نے چاؤسسکو کی جابر حکومت کا دھڑن تختہ کر دیا تھا لیکن بوسنیا میں خونریزی روکنے کی امید پر امریکہ نے جب ملازووچ کو ڈیٹن امن معاہدے کا فریق بنا دیا تو بلقان کی سیاست کو نیا رخ دینے کا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ نتیجتاً احتجاج ماند پڑ گیا حکومت نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے چند آزادیاں دیں اور یوں ملازووچ بدستور اقتدار پر براجمان رہا۔

سربیا کے سیاسی حالات میں ایک اور تغیر اس وقت آیا جب کوسوا پر فضائی حملے شروع ہوئے۔ جب تین مہینے کی مسلسل بمباری کے بعد بھی ملازووچ کو نہ ہٹایا جا سکا تو کلنٹن انتظامیہ نے اس مقصد کے لیے ایک خفیہ پروگرام کی منظوری دے دی۔ تاہم فضائی حملوں نے خفیہ امریکی منصوبے کی کامیابی کے امکانات کو معدوم کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ فضائی جنگ کے بعد سربیا میں اندرونی اختلافات پس پشت ڈال دیے گئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کسی ملک پر باہر سے حملہ ہوتا ہے تو اندرونی مخالفین حب الوطنی کے جذبے کے تحت حکومت سے تعاون پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کروشیا کی فوج کو تربیت اور عراق کی زیرزمین افواج کی حمایت جیسے معاملوں پر امریکہ کی دو بڑی سیاسی جماعتوں میں اتفاق پایا گیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ خفیہ کارروائیوں کے حوالے سے امریکہ میں خاصی سازگار فضا پائی جاتی ہے۔ یہ سازگار حالات جنگ ویت نام اور صومالیہ میں براہ راست مداخلت کے بعد کانگریس میں تقسیم کو ختم کرنے کا باعث بن رہے ہیں۔ سرد

جنگ کے بعد اب دنیا میں بد اطوار حکومتوں کے خاتمے کی امریکی کوششوں کو انسانی ہمدردی کا نام دیا جا رہا ہے۔ پھر یہ کہ ایک مخالف سپر طاقت کی غیر موجودگی میں امریکی صدر کو کھلا اختیار مل گیا ہے کہ وہ کانگریس کی حمایت سے کم خطرات کی حامل بالواسطہ کارروائیاں جاری رکھے۔

خفیہ کارروائیاں ـــــ بہتر متبادل

اگرچہ بالواسطہ اقدامات کے نتائج بھی کلی طور پر حوصلہ افزا نہیں رہے لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد براہ راست مداخلت کی امریکی پالیسی بھی کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ خلیج میں حالیہ بلاواسطہ کارروائی کو صدام حسین کی موجودگی نے بے اثر کر دیا ہے۔ کوریا، عراق، بوسنیا اور کوسووا میں محدود کارروائیاں محدود نتائج لے کر آئیں جبکہ ویت نام میں تو واضح شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ متعدد خفیہ کارروائیوں کے نتائج صدام حسین اور ملازووچ پر بمباری یا سوڈان وافغانستان پر کروز میزائل داغنے سے زیادہ حوصلہ افزا ثابت ہوئے۔ جہاں براہ راست کارروائی سے امریکہ کو بھاری جانی و مالی نقصان کا خدشہ ہو اور اس کے بین الاقوامی تعلقات متاثر ہونے کا امکان ہو وہاں خفیہ کارروائیاں نہ صرف یہ کہ کامیاب ہو سکتی ہیں بلکہ امریکی ساکھ داؤ پر لگائے بغیر جمہوری اقدار اور معاشی ترقی ان کے ذریعے فروغ پا سکتے ہیں۔ خفیہ کارروائیوں کے ناقدین کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ان کے دوران دہشت گردی اور حقوق انسانی پامال ہونے کا عنصر غالب رہا ہے لیکن یہ حقیقت بھی تو اپنی جگہ ہے کہ جن کے خلاف یہ کارروائیاں ہوئیں وہ بھی کم ظالم نہ تھے۔

فضائی حملوں پر امریکہ کا حالیہ انحصار ایک طرف اسے زمینی افواج بھیجنے سے روکتا ہے بلکہ ناپسندیدہ حکومتوں کے خاتمے میں بھی رکاوٹ ثابت ہو رہا ہے۔ عراق کے معاملے میں کلنٹن انتظامیہ نے اوائل میں صدام کے ہر مخالف گروہ کو غیر موثر کہہ کر مسترد کر دیا تھا اسی طرح کوسووا لبریشن آرمی کی حمایت پر امریکہ میں اس بنیاد پر تنقید ہوئی کہ اس سے دنیا بھر میں لسانی بنیادوں پر علیحدگی حاصل کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہو گی۔

آخری تجزیے کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سیاست ہمیشہ انوکھے ساتھیوں کی تلاش میں ہوتی ہے۔

اس لیے ریاستوں کو چاہیے کہ ہمیشہ کم تر برائی کا انتخاب کریں۔ امریکہ نے خفیہ کارروائیوں کو خیر باد کہہ کر فضائی حملوں پر جو انحصار شروع کر دیا ہے اس بنا پر ابھرتی ہوئی پیچیدہ عالمی سیاست میں اس کے لیے مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ ہر جگہ ہر ظالم کے خلاف براہ راست امریکی مداخلت بھی کوئی عقل مندی تو نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ دنیا کی واحد سپر پاور ہونے کے باوصف ہمیں ہر بحران پر نظر رکھنی ہوگی۔ احتیاط کا تقاضا ہے کہ ہم تباہ کن فضائی حملوں کا پر امن متبادل تلاش کریں جن کے سبب ہماری اخلاقی ساکھ متاثر ہو رہی ہے اور دنیا میں ہمارے لیے نت نئے مسائل سر اٹھا رہے ہیں۔ پرانے وقتوں میں آئزن ہاور نے اس دو عملی پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک نجی محفل میں کہا کہ سیاست عالم میں امریکی کردار کا روایتی تصور اس دلدل میں مشکل سے لاگو ہوتا ہے جس میں دنیا پھنسی ہوئی ہے۔ سرد جنگ سے ورثے میں ملنے والی چیزوں میں ایک یہ بھی ہے کہ جنگ اور امن کے درمیان فرق دھندلا گیا ہے۔ ماضی سے ہمیں جو سبق ملا ہے اس کا تقاضا ہے کہ مستقبل میں سربیا اور عراق میں شروع سرد جنگوں کا مقابلہ کریں۔ طاقت کا بالواسطہ استعمال ہمیں غیر ضروری عسکری پھیلاؤ، مالی نقصانات، غیر ضروری تصادم اور دیگر مصیبتوں سے نجات دلا سکتا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ فضائی جنگوں کے مقابلے میں بہتر منصوبہ بندی کی حامل خفیہ کارروائیاں کتنی زیادہ انسان دوست، موثر اور کم خرچ ہوں گی؟

[مقالہ نگار تھامس ایچ ہنر کسن ایک امریکی ادارے Hoover Institution on War, Revolution and Peace کے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر اور سینئر فیلو ہیں]